صباح الدین عبدالرحمن مرحوم

(ایک روشن چراغ تھا نہ رہا)

شاہ محی الحق فاروقی

یو پی کے مشرقی اضلاع میں اعظم گڑھ کو اس حیثیت سے ایک خاص اھمیت حاصل ہے کہ اگر اس میں ایک طرف مسلم تاریخ کے بڑے معروف لوگ پیدا ھوئے تو دوسری جانب نہ صرف شہر بلکہ اس کے بعض قصبوں میں بھی مسلمانوں کے تاریخ ساز ادارے قائم ھیں۔ مئو اور مبارک پور کے کئیدارالعلوم، سرائے میر کا مدرسۃ الاصلاح اور شہر اعظم گڑھ میں شبلی کالج اور دارالمصنفین (اور تقسیم کے بعد قائم ھونے والا جامعۃ الرشاد) ان میں نمایاں حیثیتوں کے حامل ھیں —— شبلی کالج اور دارالمصنفین شہر کے ایک کنارے پر ایک دوسرے سے متصل خاصے وسیع و عریض قطعات زمین پر قائم ھیں۔

اب تو شبلی کالج ترقی کے مدارج طے کرتا ھوا ایک ایسا ڈگری کالج بن چکا ہے جو کسی لحاظ سے ایک یونیورسٹی سے کم نہیں ہے۔ اس میں قانون سمیت پوسٹ گریجوئیشن کی کئی کلاسز ھوتی ھیں۔ لیکن جولائی ۱۹۴۱ء میں جب میں شبلی کالج کے پانچویں درجہ میں داخل ھوا تو اس وقت یہ ایک کالیجیئٹ ھائی اسکول تھا جس میں انٹرمیڈیٹ تک تعلیم ھوتی تھی ۔ اور نہ صرف تدریسی اور غیر تدریسی عملہ بلکہ پرنسپل اور وائس پرنسپل بھی کالج اور اسکول کے لئے مشترک تھے ۔ ھر لڑکا خواہ وہ تیسری جماعت میں پڑھتا ھو یا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بارھویں جماعت میں، خود کو شبلی کالج کا طالب علم کہنے میں فخر محسوس کرتا تھا ۔

بلبل همین بس است که گُل قافیه شود

تقریباً تین سال تک دارالمصنفین سے میرا تعلق بہت دور دور کا رہا ۔ شبلی کالج کے طلباء کے لیے دارالمصنفین ایک علاقہ ممنوعہ کی حیثیت رکھتا تھا ۔ آپ خود ھی سوچیئے، دارالمصنفین کا وہ بہت بڑا کتب خانہ اور پھر اس کی اندرونی سڑکوں پر دو رویہ گلابوں کے پودے اور ان کے عقب میں مختلف قسم کے پھولوں کے تختے ۔ بھلا آئینہ خانہ میں دیوانوں کو داخل ہونے کی اجازت کون دے سکتا تھا ۔ حد تو یہ ہے کہ اگر شبلی کالج کا کوئی لڑکا دارالمصنفین کی خوبصورت مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے بھی آتا تو وہ بھی همه وقت دارالمصنفین کے مہتمم مولانا مسعود علی ندوی کی عقابی نگاھوں میں رھتا ۔

کھیں ایسا نہ ھو جائے کھیں ویسا نہ ھو جائے

دارالمصنفین کے اکثر رفقاء دارالمصنفین کے اندر ھی رھتے تھے اور بیشتر وقت انھیں حدود میں گزارتے تھے ۔ عصر اور مغرب کے درمیان تھوڑی دیر کے لیے شیروانی ٹوپی سمیت پورے روایتی مشرقی لباس میں گردن جھکائے ھوئے یہ حضرات شہر کی سڑک کا ایک چکر لگا کر واپس آ جاتے ۔ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم اور مولوی مسعود علی ندوی مرحوم اکثر دارالمصنفین کی اندرونی سڑکوں پر ھی چھل قدمی کرتے لیکن بقیہ رفقاء شہر کی جانب نکل جاتے ۔ ان حضرات کے وقار کا عالم یہ تھا کہ نہ صرف شبلی کالج کے طلبہ اور عام مسلمان بلکہ ھندو بھی بلاتخصیص تعلیم یافتہ ھو یا ان پڑھ اُن لوگوں کو دیکھتے ھی ادب و احترام کے ساتھ سلام کرتا ۔ حتیٰ کہ اکثر دوکاندار بھی ان لوگوں کو سلام کرنے کے لیے اپنی دوکانوں کے سامنے کھڑے ھو

جاتے ۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ ان سلام کرنے والوں کی اکثریت کے لیئے غالباً دارالمصنفین جیسا ثقیل نام بھی نامانوس تھا ۔ شہر میں یہ ادارہ شبلی منزل کے نام سے مشہور تھا اور ,شبلی منزل کے ,,مولی ساب،، (مولوی صاحب)، کی حیثیت سے ھی یہ حضرات عام عزت و احترام کے مستحق سمجھے جاتے تھے ۔ مجنوں کو بچہ بچہ جانتا ہے قیس عامری کو کتنے لوگ جانتے ھیں؟

میں آٹھویں جماعت میں پہنچا تو اس وقت تک میرے ایک بزرگ عزیز مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی (بانی و صدر جامعة الرشاد) ندوة العلماء لکھنؤ سے فارغ التحصیل ھو کر دارالمصنفین میں بطور رفیق آ چکے تھے ۔ وہ بھی دارالمصنفین ھی میں رھتے تھے اور انھیں کی وساطت سے مجھے بھی رھنے کے لیے دارالمصنفین میں ایک کمرہ مل گیا تھا ۔ یہاں تین سال تک مجھے رفقاء دارالمصنفین کے روز و شب دیکھنے کا موقع ملا ۔ یہیں آ کر مجھے یہ معلوم ھوا کہ قازوں میں قاز نظر آنے والا ایک پرندہ اپنی اصل کے اعتبار سے بقیہ سب پرندوں سے الگ تھا ۔ میری موجودگی میں رفقاءِ دارالمصنفین کے سربراہ مولانا سید سلیمان دِسنوی (بہار) اور بقیہ رفقاء مولانا عبدالسلام اعظم گڑھی، شاہ معین الدین احمد ردولوی، بارہ بنکی (یوپی) قاری ریاست علی گیاوی (بہار) مولانا اوویس نگرامی (لکھنؤ) مولانا مجیب اللہ غازی پوری (یوپی) اور زیر تربیت رفقاء میں وحید قیصر گیاوی اور وحیدالرحمن بچھرانوی، مراد آباد (یو پی) سب کے سب ندوة العلماء کے فارغ التحصیل اور اسی لحاظ سے ندوی کہلاتے تھے لیکن ان سب کے برعکس صباح الدین عبدالرحمن دِسنوی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم اے کر کے دارالمصنفین آئے تھے ۔ اگر ایک طرف دوسرے رفقاء اپنے تحقیقی کاموں کے لیے عربی کتابوں کی مدد لیتے تو دوسری طرف صباح الدین صاحب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انگریزی اور فارسی کے ذریعہ اپنے علمی کاموں میں مشغول رہتے تھے
مجھے معلوم نہیں کہ ان کا مزاج شروع ہی سے ایسا تھا یا دارالمصنفین نے انہیں متاثر کیا بہرحال میں نے جب سے انہیں دیکھا وہ کسی لحاظ سے مسلم یونیورسٹی تو کجا کسی بھی یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے نظر نہیں آتے تھے بلکہ اپنے رہن سہن اور نشست و برخاست کے لحاظ سے وہ اپنے ندوی رفقاء کے رنگ میں پوری طرح رنگے ہوئے تھے ۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بہت سے ندویوں سے زیادہ ندوی نظر آتے تھے ۔ اس پابندی وضع کے حصول کی خاطر وہ دوسروں پر بھی نظر رکھتے تھے مثلاً زیر تربیت رفیق★ وحید قیصر صاحب مرحوم پر ندوی ہونے کے باوجود ندوہ سے متصل ایک دوسرے تعلیمی ادارہ یعنی لکھنؤ یونیورسٹی کا اثر زیادہ تھا ۔ بعض عینی شاھدوں کا بیان تھا کہ لکھنؤ کے دوران قیام اساتذۂ ندوہ کی آنکھ بچا کر وہ یونیورسٹی کے لڑکوں کے ساتھ شام کو ھاکی کھیلتے تھے ۔ ھیرا پھیری کی اس عادت کو انھوں نے اعظم گڑھ میں بھی قائم رکھنا چاھا ۔ شام کو بغل میں تولیہ کے اندر نیکر دبا کر چہل قدمی کے بہانے وہ شبلی کالج کے ھاکی گراؤنڈ میں پہنچ جاتے اور لباس تبدیل کر کے ھاکی کھیلنے لگتے ۔ جب کبھی دارالمصنفین میں یہ اندوھناک خبر پہنچ جاتی تو ایک تہلکہ مچ جاتا ۔ اس موقع پر یہ منظر دیدنی ہوتا کہ سربراہِ دسترخوان شاہ معین الدین صاحب مرحوم اور دوسرے رفقاء تو عموماً اپنی خاموشی سے اپنے صدمہ اور ناراضگی کا اظہار کرتے لیکن صباح الدین صاحب مرحوم وحید قیصر صاحب کی خبر لینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے اور انھیں مولانا شبلی سے لے کر اپنے عہد

★ قیام پاکستان کے بعد وحید قیصر صاحب مشرقی پاکستان گئے اور وھاں بطور صحافی کامیاب زندگی گزاری ۔ روزنامہ جنگ کے نمائندہ کے طور پر بھی کام کیا ۔ دسمبر ۱۹۶۹ء میں ڈھاکہ میں وفات پائی ۔

تک کے تمام ندویوں کی متانت اور سنجیدگی کی روایتیں سنا کر شرمندہ کرنے کی کوشش کرتے ۔ وحید صاحب مرحوم گردن جھکا کر پوری سعادت مندی کے ساتھ نصیحتیں سن لیتے اور ایک آدھ دن کا وقفہ دے کر ع

نکل گھر سے پھر راہ جنگل کی لی

ابھی میں نے رفقاءِ دارالمصنفین کی شام کی سیر کا ذکر کیا تھا ۔ دارالمصنفین میں رہ کر میں نے دیکھا کہ جب تک یہ حضرات واپس آتے اس وقت تک یہاں شہر کے چند معززین آ چکے ہوتے ۔ ان میں شبلی کالج کے پرنسپل استاذی جناب بشیراحمد صدیقی مرحوم، ان کے برادرِنسبتی اور کالج کے وائس پرنسپل استاذی جناب نیاز احمد صدیقی جو مشہور ادیب رشید احمد صدیقی مرحوم کے چھوٹے بھائی تھے، اعظم گڑھ کے مشہور طبیب حکیم محمد اسحق صاحب مرحوم اور مشہور قومی رہنما ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے ایک قریبی عزیز اور خود بھی انتہائی وضعدار ڈاکٹر جناب حفیظ انصاری مرحوم خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۔ یہ حضرات تو بلاناغہ آنے والوں میں تھے لیکن کچھ معززین ایسے بھی تھے جو آٹھویں دسویں دن آتے ان میں اکثریت شہر کے معروف وکلاء کی تھی جو غالباً اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کی وجہ سے ہر روز نہیں آ سکتے تھے ۔ ان میں نمایاں حضرات مشہور شاعر جناب اقبال سہیل مرحوم اور شبلی کالج کی مجلس منتظمہ کے صدر اور پاکستان آرمی کے موجودہ وائس چیف آف سٹاف جنرل مرزا اسلم بیگ کے والد جناب مرزا مرتضیٰ بیگ مرحوم تھے ۔

یہ تمام حضرات وہ تھے جن کا احترام پورا شہر کرتا تھا ۔ یہ لوگ وضعداری اور اعلیٰ روایتوں کے پیکر تھے ۔ اب ان میں سے کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یاد آتا ہے تو بے ساختہ وہ مشہور شعر بھی یاد آ جاتا ہے ع

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

شام کی ان نشستوں میں یہ تمام حضـرات کبھی کبھار کوئی علمی یا ادبی گفتگو کرتے ورنہ زیادہ تر ہلکی پھلکی اور ہنسی مذاق کی باتیں ہوتیں ۔ اس موقع پر مولانا عبدالسلام صاحب اپنے روایتی انداز میں بھولی بھولی باتیں کرتے اور صباح الدین صاحب بیچ بیچ میں اپنے جملوں سے محفل کو پرلطف بناتے رہتے تھے ۔ صباح الدین صاحب کا یہ مشغلہ دسترخوان پر بھی جاری رہتا بلکہ وہاں کچھ عملی شکل بھی اختیار کر لیتا ۔ یوں تو دارالمصنفیـن کا روزمـرہ دسترخوان ھی اپنی کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے نہ صرف اعظم گڑھ شہر بلکہ گردونواح کے علمی اور ادبی حلقـوں میـں خاص شہرت کا حامل تھا لیکن اگر کبھی باھر سے کوئی مہمان آ جاتا جو اکثر آتے رہتے تھے تو پھر تو زبردست دعوت کا اہتمام ہوتا ۔

معیاری اور اعلیٰ پایہ کے مأکولات کے علاوہ اس دسترخوان کی ظاھری حیثیت بھی بڑی روایتی تھی ۔ چھوٹے پایوں کی تپائیوں پر سفید چادر کا دسترخوان اور اس پر چینی کی خوبصورت پلیٹیں اور اس کے اردگرد صاف ستھری دُھلی ہوئی سفید چاندنی پر شرکاء کی فرشی نشست ہوتی ۔ یہ ایک روایت تھی اور دارالمصنفین میں روایت شکنی کی کوئی روایت نہ تھی ۔ روایت شکنی کیا، رفقاءِ دارالمصنفین تو عموماً اور صباح الدین صاحب خصوصاً بت شکنی بھی ایسے انداز سے کرتے تھے کہ کسی بت پرست کو تکلیف نہ پہنچ جائے ۔ اس ضمن میں یہ مردِ مومن اپنے قول و فعل اور تحریر و تقریر میں مومن کے اس شعر کی عملی شرح نظر آتا تھا کہ ع

لائے اُس بُت کو التجا کر کے
کـفـر ٹوٹا خـدا کـر کے

دستر خوان پر رفقاءِ دارالمصنفین کی متانت تھوڑی دیر کے لیے رخصت ہو جاتی تھی ۔ بالخصوص مولانا عبدالسلام صاحب اکثر و بیشتر صباح الدین صاحب کی زیادتیوں کا نشانہ بنتے رہتے تھے ۔ کبھی مولانا کی فرنی کی پلیٹ غائب ہو جاتی اور کبھی شاہی ٹکڑے کی ۔ مولانا اپنی مصنوعی برھمی کا اظہار کرتے اور صباح الدین صاحب انھیں سمجھاتے کہ باورچی کی غلطی یا کسی مہمان کی غیر متوقع آمد کی وجہ سے ایک پلیٹ کم پڑ گئی ۔ مولانا بطور احتجاج پوچھتے کہ آخر اس کمی کا نشانہ ہمیشہ میں ہی کیوں بنتا ہوں اور صباح الدین صاحب کہتے کہ سب سے زیادہ بزرگ کو سب سے زیادہ ایثار سے کام لینا پڑتا ہے ۔ کبھی کبھار اس قضیہ کو سلجھانے میں شاہ معین الدین صاحب کو بھی اپنا کردار ادا کرنا پڑتا اور ظاہر ہے ان کا فیصلہ بھی صباح الدین صاحب ہی کے حق میں ہوتا ۔ آخر صباح الدین صاحب دستر خوان پر موجود ملازم علی حسین کو حکم دیتے کہ ,,جاؤ ۔ حسینی (یعنی خانساماں) سے ان کے حصہ کی پلیٹ مانگ لاؤ،، ۔ اس طرح پلیٹ آ جاتی اور مولانا کا مسئلہ حل ہو جاتا ۔

دارالمصنفین میں تنہا رہنے والے رفقاء کے اس دسترخوان کا انتظام صباح الدین صاحب ہی کے سپرد تھا اور جس اہتمام اور دقیقہ ریزی کا مظاھرہ وہ ,بزم تیموریہ، اور ,بزم صوفیہ، وغیرہ لکھنے میں کرتے تھے اتنے ہی انہماک سے بزم دارالمصنفین کے باورچی خانہ کا حساب کتاب بھی کرتے تھے ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کھانا تو ہر شریک اپنے جثہ کے مطابق کھاتا لیکن اخراجات کی ادائیگی جیب کے مطابق کرتا اور ظاہر ہے طالب علم ہونے کی وجہ سے اس وقت سب سے زیادہ فائدہ میں میں تھا ۔

کچھ اوپر جب میں نے ان چند بڑے لوگوں کا ذکر کیا جو دارالمصنفین کی محفلوں یادعوتوں کی زینت بنتے تھے تو اس میں ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہت بڑے آدمی کا نام تو میں بھول ہی گیا تھا حالانکہ اُنھیں دارالمصنفین میں ایک خاص مقام دلانے میں سب سے زیادہ کردار غالباً صباح الدین صاحب ہی نے ادا کیا ہوگا ۔ یہ بزرگ تھے اعظم گڑھ کی اکلوتی قابلِ ذکر بیکری کے مالک حاجی عبدالغفور صاحب مرحوم ۔ اُن کا خستہ بسکٹ اطراف و اکناف میں مشہور تھا اور اسی رعایت سے اُن کا تخلص بھی خستہ تھا ۔ رشید احمد صدیقی مرحوم نے حاجی صاحب پر ایک مضمون لکھا ہے جو غالباً ان کے مجموعہ ,,خنداں،، میں موجود ہے۔ حاجی صاحب اُس دیار میں اَن پڑھ شعراء کے سرخیل تھے ۔ وہ پوری پابندی کے ساتھ رفقاءِ دارالمصنفین کے ساتھ ناشتہ میں شریک ہوتے اور اپنی ٹوکری میں اپنے کلام کے ساتھ اپنی خوردنی مصنوعات بھی لاتے ۔ اُن کی خستہ شاعری شرکاءِ دسترخوان کے لیے لذّتِ گوش اور خستہ بسکٹ لذّتِ کام و دھن کا باعث بنتے ۔ حاجی صاحب کا لہجہ پوربی اور اُن کا تلفظ، شین قاف، سے بےنیاز تھا ۔ صباح الدین صاحب کا کام یہ تھا کہ وہ حاجی صاحب کی تلمیحات کی وضاحت کریں اور ان کے مہمل اشعار کی تشریح و توضیح بھی اس طرح کر دیں کہ نہ سمجھنے والے بھی یہ سمجھ لیں کہ ع

سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

شبلی کالج میں استاذی جناب بشیر احمد صدیقی مرحوم کے زیر انتظام ایک زبردست قسم کا مشاعرہ منعقد ہوا جس میں جگر مراد آبادی، شکیل بدایونی، نشورواحدی اور مجروح سلطانپوری وغیرہ سمیت اس عہد کے تقریباً تمام قابلِ ذکر شعراء موجود تھے ۔ اس مشاعرہ میں حاجی صاحب نے بھی اپنا کلام عطا کیا اور اُس سے پہلے صباح الدین صاحب نے چھ سات صفحات پر مشتمل ایک نہایت دلچسپ مضمون ان کی شاعری پر پڑھا،جسے سن کر لوگوں

کو یقین آ گیا ہوگا کہ مردِ مشاعرہ تو حاجی صاحب ہی ہیں بقیہ سب تو گردِ مشاعرہ ہیں ۔

دارالمصنفین کے دوران قیام صباح الدین صاحب سے میرا تعلق بس اتنا تھا کہ ساتھ کھانا کھا لیا ۔ انگریزی کی نصابی کتاب میں کوئی دشواری پیش آئی تو اُن سے رہنمائی حاصل کر لی یا کبھی خود انھوں نے کچھ پوچھ لیا تو پورے ادب و احترام کے ساتھ جواب دے دیا ۔ اس موقع پر بھی وہ اکثر ظرافتِ طبع سے کام لیتے ۔ وہ مجھ سے کہتے کہ دارالمصنفین میٹرک کے طلباء کو راس نہیں آتا ۔ کچھ اتفاق ایسا تھا کہ مجھ سے پہلے اپنے بزرگوں کے ہمراہ دارالمصنفین میں رہنے والا کوئی طالب علم بھی میٹرک پاس نہ کر سکا تھا ۔ حالات کچھ ایسے پیش آ جاتے کہ وہ اُس سے پہلے ہی اعظم گڑھ چھوڑ کر کہیں اور چلے جاتے تھے یا شاید ان میں سے ایک آدھ ناکام بھی ہوگئے تھے ۔ صباح الدین صاحب اُن تمام لوگوں کا نام لے کر مجھ سے کہتے کہ یا تو تم دارالمصنفین چھوڑ دو یا پھر یہ ریکارڈ توڑ دو ۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں نے دارالمصنفین ہی میں رہ کر میٹرک پاس کر کے ان کی یہ معصوم خواہش پوری کر دی ۔

حقیقت یہ ہے کہ دارالمصنفین میں برسوں تک شب و روز رہ کر میں صباح الدین صاحب سے اتنا قریب کبھی نہ رہا جتنا قریب پاکستان میں وقفہ وقفہ سے چند گھنٹوں کی ملاقات میں رہتا تھا ۔ میں ۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے سے پہلے میٹرک کر کے اعظم گڑھ چھوڑ چکا تھا اور پاکستان بنتے ہی کراچی آ گیا تھا ۔ یہاں ان سے میری پہلی ملاقات عشرہ ۱۹۵۰ء کی ابتداء میں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب مرحوم کی قیام گاہ پر ہوئی تھی جہاں وہ غالباً عارضی طور پر ٹھہرے ہوئے تھے ۔ یہاں بھی میں نے ابتدائی فاصلہ کو قائم رکھنا چاہا لیکن انھوں نے اپنی خوش طبعی کے ذریعہ میری ہمت افزائی کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے خود اس فاصلہ کو اتنا کم کر دیا کہ اب میں پورے ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُن سے کھل کر تفصیلی باتیں کر سکتا تھا ۔ اس وقت ان کے اعلیٰ کردار کے بہت سے پہلو میرے سامنے آئے ۔

دارالمصنفین میں میری موجودگی ھی میں کچھ اندرونی چپقلش پیدا ہو چکی تھی اور غالباً کچھ اسی قسم کی سیاست سے بیزار ہو کر سید صاحب مرحوم دارالمصنفین چھوڑ کر بھوپال چلے گئے تھے ۔ اعظم گڑھ چھوڑنے کے بعد بھی مجھے دارالمصنفین کے حالات جستہ جستہ معلوم ہوتے رہے ۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ شاہ معین الدین صاحب کی سرکردگی اور صباح الدین صاحب کی انتھک محنت کے باعث شعبۂ انتظامیہ جو سید صاحب مرحوم کو زچ کر چکا تھا شعبۂ علمی سے مات کھا گیا اور کچھ دنوں بعد صباح الدین صاحب دارالمصنفین کے لیے روحِ رواں بن گئے بلکہ شاہ صاحب کے انتقال کے بعد علم اور انتظام کا مشترکہ تاج صباح الدین صاحب ھی کے سر پر رکھا گیا ۔

اپنے زمانۂ اقتدار میں صباح الدین صاحب نے دارالمصنفین کے لیے بہت کچھ کیا ۔ ۱۹٦۰ء کے عشرہ میں انھوں نے دارالمصنفین کی جوبلی بڑی دھوم دھام سے منائی اور اسے دارالمصنفین کے لیے مالی منفعت کا ایک ذریعہ بنایا ۔ اس میں صدر جمہوریہ ھند ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے علاوہ تقریباً تمام قابل ذکر حضرات نے شرکت کی ۔ صباح الدین صاحب سے اسلام آباد میں میری ملاقات ہوئی تو اگرچہ جوبلی کو کئی سال گزر چکے تھے لیکن وہ مزے لے لے کر اس کی تفصیل سناتے رہے ۔ کہنے لگے ,,میاں تمھیں مبارک ھو ۔ یوں تو جوبلی کے جلسوں میں بہت سے لوگوں نے تقریریں کیں اور مقالات پڑھے لیکن چند مقالے جو واقعی بہت اچھے تھے ان میں سے ایک تمھارے پاکستانی قونصل جنرل کا مقالہ بھی تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ

لوگ ان سے بہت متاثر ہوئے،، ۔ میں نے از راہ تفنن ان سے کہا کہ ،،خیر، ڈاکٹر افضل اقبال صاحب کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے لیکن اگر آپ نے ہمارے ہائی کمیشن کے کسی معمولی اہلکار کو بھی مدعو کر لیا ہوتا تو وہ بھی آپ کی برگزیدہ شخصیتوں کے مقابلہ میں آپ کو مایوس نہ کرتا،، ۔ میری اس شوخی پر وہ کچھ دیر ہنستے رہے اور اس قسم کی ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے۔

دارالمصنفین کے لیے صباح الدین صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ پاکستان سے دارالمصنفین کی کتابوں کی رائلٹی کا حصول تھا ۔ اس ہفت خواں کو طے کرنے میں انھیں بڑی محنت کرنی پڑی ۔ انگریزی مقولہ کے مطابق انھیں مینار سے کھمبے تک دوڑنا پڑا اور حقیقت یہ ہے کہ اپنی کمزور صحت کے باوجود منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے وہ خوب خوب دوڑے ۔ پوری تگ و دو کے بعد اس مہم میں سرخرو ہو کر جب وہ ہندوستان واپس گئے تو ،،معارف،، میں پوری جزئیات کے ساتھ اس واقعہ کی تفصیل لکھی اور جن جن لوگوں نے اس نیک کام میں ان کی ذرا بھی مدد کی تھی دل کھول کر ان سب کا نام بہ نام شکریہ ادا کیا ۔ ناسپاسی ہوگی اگر میں اس کا ذکر اور اعتراف نہ کروں کہ اس پورے معاملہ میں میرا کردار بہت ہی ضمنی اور معمولی تھا یعنی دو ایک دفتروں میں متعلقہ مسل کو ایک میز سے دوسری میز تک پہنچانے میں میں نے کچھ خدمات انجام دی ہوں گی یا پھر کبھی کبھار میں نے ان کی ہمراہی میں بعض دفتروں کے چکر لگائے ہوں گے لیکن یہ ساری بھاگ دوڑ اس احسانِ عظیم کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھی جو دارالمصنفین نے مجھ پر کیا تھا۔ تاہم صباح الدین صاحب کی عظمت یہ تھی کہ انھوں نے میرا نام بھی معارف میں درج کر کے مجھے زندۂ جاوید کر دیا ۔ بلکہ اس واقعہ کے دو یا تین سال بعد مجھے چند دنوں کے لیے اعظم گڑھ جانے اور دارالمصنفین کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مہمان خانہ میں رہنے کا اتفاق ہوا تو اگرچہ صباح الدین خود ان دنوں وہاں موجود نہ تھے لیکن وہ تحریری ہدایت چھوڑ گئے تھے کہ مجھے (انھیں کے الفاظ میں) Royal Reception دیا جائے اور میں تیس پینتیس عمائدین شہر کے ساتھ ,,شاھی استقبالیہ،، میں بیٹھا یہ سوچ کر شرمندہ ہوتا رہا کہ دارالمصنفین میں رہ کر میٹرک پاس کرنے کے علاوہ میں نے آخر اور کون سا کارنامہ انجام دیا ہے جس کے لیے میری یہ عزت افزائی ہو رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں کی یہی محبت ہے جو اس دنیا کو زندہ رہنے کے قابل بناتی ہے۔ وہ اپنے چھوٹوں کو کتنا بڑا بنا دیتے ھیں۔

دارالمصنفین کو قائم ہوئے ستر سال سے کچھ اوپر ہوئے۔ صباح الدین صاحب ۱۹۳۰ء کے عشرہ میں وھاں آ گئے تھے۔ اس حساب سے انھوں نے وھاں پچاس سال سے زیادہ گزارے اور یہ دارالمصنفین کے کسی بھی رفیق کے مقابلہ میں طویل ترین عرصہ ہے۔ گذشتہ تقریباً تیس سال سے وہ بلاشرکت غیرے دارالمصنفین کے سیاہ و سفید کے مالک تھے لیکن ان کے انکسار، فروتنی اور اصول پسندی کا عالم یہ تھا کہ کوئی محفل ہو یا نجی گفتگو وہ ھمیشہ یہی تاثر دیتے کہ ان کی حیثیت دارالمصنفین کے ایک معمولی اھلکار کی ہے۔ رائلٹی کے سلسلہ میں جب وہ پاکستان آئے تو اگرچہ معاھدہ کرنے کا اختیار کُلی لے کر آئے تھے لیکن جب یہاں معاملات قطعی شکل اختیار کرنے لگے اور رقم کا تعین ہونے لگا تو انھوں نے پھر تار کے ذریعہ اپنی منتظمہ کمیٹی کی منظوری حاصل کی۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتے اپنے ادارہ کو نمایاں کرنے میں منہمک ہو جاتے اور اس انہماک میں ان کی اپنی ذات گم ہو کر رہ جاتی۔ کسی لحاظ سے وہ یہ تاثر پیدا نہ ہونے دیتے کہ وہ صرف دارالمصنفین کے نمائندہ ھی نہیں بلکہ خود ایک درجن کے قریب مستند کتابوں کے مصنف بھی ھیں•۔

جس کسی سے صباح الدین صاحب کا ایک بار تعلق قائم ہو جاتا اس کے بارے میں وہ پوری دلچسپی لیتے ۔ اس کی خوشی میں خوش ہوتے اور اس کی پریشانی میں پریشان ہوتے اور اس میں کسی لحاظ سے کوئی تصنع نہ ہوتا بلکہ واقعی یہ ان کے دل کی آواز ہوتی تھی ۔ اب سے چھ سات مہینے پہلے جب میں ترقی پاکر کراچی سے راولپنڈی آیا تو اتفاق سے انھیں دنوں ہندوستان میں میرے بھائی (ڈاکٹر مشیر الحق) بھی سری نگر یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے تھے ۔ کچھ دنوں بعد راولپنڈی میں میرا شامِ ہمدرد میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں اچانک صباح الدین صاحب نظر آئے ۔ میں لپک کر ان کے پاس گیا ۔ انھوں نے گلے لگایا ۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ جب یہ مجھ سے پوچھیں گے کہ تم کراچی سے پھر یہاں کیسے آگئے تو میں انھیں کسی نہ کسی طور اپنی ترقی کی خبر سنا دوں گا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے نیاز مندوں کے تمام معاملات سے پوری طرح باخبر رہتے تھے ۔ خود ھی کہنے لگے ,,بھئی تمھیں تو دوھری مبارک باد دینی ہے،، پھر وہ بھائی جان کے بارے میں باتیں کرتے رہے ۔ رخصت ہوتے وقت مجھ سے کہا کہ ,,تم ہوٹل آؤ تو تفصیل سے باتیں کریں گے،، ۔ میں دوسرے دن گیا ۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد انھوں نے کہا کہ ,,تم لوگوں کی رائلٹی کا روپیہ اگر ایک طرف دارالمصنفین کے لیے نسبتاً فراخی کا باعث بنا ہے تو دوسری جانب بہت سے لوگوں کے لیے تنگیِ قلب کا سبب بھی ہوگیا ہے،، ۔ اس کے بعد انھوں نے مجمل طور پر جس مقامی گروھی چپقلش کا ذکر مجھ سے کیا اسے آپ لسان العصر حضرت اکبر آبادی کی زبان میں یوں سمجھیئے کہ :

کبھی اسلام لائے تھے کہ ہو دینِ خدا قائم
اور اب مشرب بدلتے ھیں کہ ہو اپنا جتھاقائم

یہ صباح الدین صاحب سے میری آخری ملاقات تھی اور اب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انھوں نے شہادت کی جو موت پائی اس کی بنا پر یقین ہے کہ عقبیٰ میں انھیں اتنا اونچا درجہ ملے گا کہ وھاں بھی ان سے اب ملاقات کا امکان نظر نہیں آتا ۔ بہرحال ھمارے لیے یہی بہت ہے کہ جب تک زندہ رھیں یہ سوچ سوچ کر خوش ھوتے رھیں کہ ھم نے کیسے کیسے عظیم لوگوں کو دیکھا ہے۔ کارواں تو گزر چکا اب اُس کی گرد باقی رہ گئی ہے کچھ دنوں میں وہ بھی بیٹھ جائے گی ۔ باقی ,,رہے نام اللہ کا،،

●●●